رگِ جاں

صد رگِ جاں کو تاب دے باہم
تیری زلفوں کا ایک تار کیا

میر

رگِ جاں

خورشید الاسلام

ملنے کا پتہ—

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

جان ہار

قدسیہ آپا کے نام

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل

پیش لفظ

خورشیدالاسلام کو ادبی اور تعلیمی دنیا میں روشناس ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے اور اب وہ ایک مستقل اور مستحکم مقام حاصل کر چکے ہیں - میں نے علی گڑھ آنے سے پہلے ان کے صرف تنقیدی اور ادبی مضامین پڑھے تھے اور میں ان کو ایک نکتہ شناس اور متوازن ادبی نقاد کی حیثیت سے جانتا تھا - ان کی تنقیدی تحریروں میں ایک انشائی کیفیت ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی ہر تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا ایک غیر معمولی تخلیقی شعور رکھتا ہے -

علی گڑھ آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ خورشیدالاسلام شاعر بھی ہیں - لیکن اپنے شعر خاص خاص حلقوں میں سناتے ہیں - مجھے پہلے ان محفلوں میں اور پھر ریڈیو پر ان کا کلام سننے کا اتفاق ہوا - ان کی غزلیں اور نظمیں بعض رسالوں میں نظر سے گذریں، مجھ پر جو مجموعی اثر ہوا وہ یہ ہے کہ اول تو خورشیدالاسلام نمود اور شہرت کے لئے شعر نہیں کہتے بلکہ اپنی اندرونی تحریک سے اور اس کی تسکین کے لئے

لکھتے ھیں، دوسرے وہ اپنے تمام جدید میلانات کے باوجود محض اجتہاد یا جدت طرازی سے کام نہیں لیتے ۔ ان کا مطالعہ وسیع ھے، وہ مشرق و مغرب کے ادب پر گہری نظر رکھتے ھیں اور ان کو اردو شاعری کے قدیم و جدید اساتذہ و مشاھیر کے کلام پر مبصرانہ عبور حاصل ھے اس مطالعہ سے انھوں نے اپنے شعور شعری کی تربیت میں بڑا کام لیا ھے ۔ یہی وجہ ھے کہ ان کی انقلابی سے انقلابی اور باغیانہ سے باغیانہ میلانات کی حامل نظم یا غزل میں بھی ایک کلاسیکی سنجیدگی نظر آتی ھے جو پرخلوص مطالعہ اور اس مطالعے کے اثرات کو اپنی فطرت شعری کا ترکیبی جز بنائے بغیر ممکن ھی نہیں ۔

میں کسی صاحب قلم کی تحریروں کو تنقید اور تخلیق کے الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا قایل نہیں ۔ دنیا میں ایسی مثالیں کم نہیں ھیں کہ شاعر ناقد رھا ھو یا ناقد شاعر، سرفلپ سڈنی، ڈرائیڈن، طامس گرے، کولرج، ورڈسورتھ، شیلی اور میتھو آرنلڈ، اس کی بہترین مثالیں ھیں ۔ ان میں سے بعض شاعر زیادہ تھے اور بعض ناقد زیادہ ۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری ان کی تنقید کو اور ان کی تنقیدی بصیرت ان کی شاعری کو صحت مند طور پر

متاثر کرتی رہی ہے ۔ یہ سمجھ لینا کہ ایک شاعر تنقید نہیں کر سکتا یا ایک ناقد شاعر نہیں ہو سکتا، شاعری کا محدود تصور ہے جس کی بنیاد چند روایتی مفروضات پر ہے ۔ آج زندگی جس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے اسی اعتبار سے شعر اور فن کاری کا دائرہ بھی وسیع ہوگیا ہے، جو ایک فطری اور لازمی امر تھا ۔

خورشیدالاسلام کی شاعری میں ربودگی، خودباختگی اور گم شدگی کا احساس تو کم ملتا ہے لیکن ان کے یہاں جذباتی شدت خلوص کے ساتھ وہ توازن اور سنجیدگی محسوس ہوتی ہے جو فکر و تامل ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے ۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں احساس و تاثر کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے، لیکن وہ بغیر سوچے سمجھے اپنے تاثرات کو الفاظ میں ظاہر نہیں کرتے ۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور شاعری کی ایک اہم قسم وہ بھی ہے جس میں شدت تاثر اس ضبط و اعتدال کی پابند ہو جو تفکر کا تقاضا ہے ۔ خورشیدالاسلام کے اسلوب کی انفرادیت میں اسی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے ان کا ایک شعر ہے :

اسی کا نام ازل ہے، اسی کا نام ابد
وہ ایک رات جو پھولوں کے درمیاں گذری

اس شعر کا تاثر کوئی غیر معمولی یا اچھوتا نہیں لیکن اس کی
سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ایسے احساس کا اظہار ہے
جو اگرچہ عامتہ الورود ہے مگر جس کے اظہار پر ہر کس و
ناکس قادر نہیں - اس سے پہلے بھی اس مضمون کے اشعار
کہے جا چکے ہیں لیکن جو خصوصیت اس شعر کو ہمارے
لئے نیا شعر بنائے ہوئے ہے وہ زبان و اسلوب کا نیاپن ہے -
یہ نیاپن بیک وقت شاعر کی جدت تخیل اور اس کی وسعت
مطالعہ کی ہم آہنگی سے پیدا ہوا ہے -

خورشیدالاسلام کی نظموں اور غزلوں میں اس قسم کے
اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں - ان کے یہاں قدیم و جدید کا
ایک خوشگوار اور بلیغ توازن ہے ، ماضی کی زندہ روایتیں
ایک جدید اسلوب میں سامنے آتی ہیں اور حال کے مسائل
ایک کلاسیکی لہجے میں پیش ہوتے ہیں -

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے خورشیدالاسلام محض
شاعر ہی نہیں ، وہ ایک بالغ نظر ناقد کا شعور بھی رکھتے ہیں
ان کی فنی بصیرت اس ناقدانہ شعور کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر
شعر کے سانچے میں ڈھلتی ہے - جس طرح انھوں نے نثر میں
اپنا ایک الگ اسلوب نکالا ہے اسی طرح ان کی شاعری
میں بھی ایک نئے لہجے اور اسلوب کے عناصر ملتے ہیں -

نثر ہو یا شعر، اسلوب انفرادیت کے بھرپور اظہار ہی سے بنتا ہے ۔ خورشیدالاسلام کی نظمیں ہوں یا غزلیں ان میں ایک ایسی انفرادیت نمایاں ہے جسے انکشاف ذات کہا جا سکتا ہے ۔ یہ انفرادیت ایک ایسے شاعر کی ذات کا انکشاف ہے جس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے تجربے کو جذبے کی شدت کے ساتھ محسوس بھی کیا ہے ۔ جذبہ جتنا واضح اور روشن ہوگا اسی قدر اس میں تفکر کی پرچھائیاں بھی پڑیں گی ۔ خورشیدالاسلام کے جذبے کی شدت اور وضاحت ہی کہیں کہیں ان کے اشعار میں فکر کی اساس بن گئی ہے ۔ خورشیدالاسلام کے مختصر سے مجموعۂ اشعار میں ان کی انفرادیت کا اظہار ان ہی دو عناصر کے سہارے ہوتا ہے ۔ انکشاف ذات جو کسی ایک فرد کی ذات کا انکشاف نہیں بلکہ پورے معاشرے کے تلخ و ترش حقایق کا انکشاف ہے ۔ مگر ان کی شاعری میں بعض دوسرے معاصر شعراء کی طرح گھٹے ہوئے انفرادی غم کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی کھلی فضا ملتی ہے جس میں ایک ذات کا غم ساری انسانیت کا غم بن جاتا ہے ، اور اسی میں ان کی انسان دوستی کا جاندار تصور نمایاں ہوتا ہے ۔ طنز کی تلخی ، جس میں کلبیت نہیں بلکہ ماحول کے واضح شعور کے ساتھ محسوسات اور جذبات کے

اس شعر کا تاثر کوئی غیر معمولی یا اچھوتا نہیں لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ایسے احساس کا اظہار ہے جو اگرچہ عامتہ الورود ہے مگر جس کے اظہار پر ہر کس و ناکس قادر نہیں - اس سے پہلے بھی اس مضمون کے اشعار کہے جا چکے ہیں لیکن جو خصوصیت اس شعر کو ہمارے لئے نیا شعر بنائے ہوئے ہے وہ زبان و اسلوب کا نیاپن ہے - یہ نیاپن بیک وقت شاعر کی جدت تخیل اور اس کی وسعت مطالعہ کی ہم آہنگی سے پیدا ہوا ہے -

خورشیدالاسلام کی نظموں اور غزلوں میں اس قسم کے اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں - ان کے یہاں قدیم و جدید کا ایک خوشگوار اور بلیغ توازن ہے، ماضی کی زندہ روایتیں ایک جدید اسلوب میں سامنے آتی ہیں اور حال کے مسائل ایک کلاسیکی لہجے میں پیش ہوتے ہیں -

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے خورشیدالاسلام محض شاعر ہی نہیں، وہ ایک بالغ نظر ناقد کا شعور بھی رکھتے ہیں ان کی فنی بصیرت اس ناقدانہ شعور کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر شعر کے سانچے میں ڈھلتی ہے - جس طرح انہوں نے نثر میں اپنا ایک الگ اسلوب نکالا ہے اسی طرح ان کی شاعری میں بھی ایک نئے لہجے اور اسلوب کے عناصر ملتے ہیں -

نثر ہو یا شعر ، اسلوب انفرادیت کے بھرپور اظہار ہی سے بنتا ہے - خورشیدالاسلام کی نظمیں ہوں یا غزلیں ان میں ایک ایسی انفرادیت نمایاں ہے جسے انکشاف ذات کہا جا سکتا ہے - یہ انفرادیت ایک ایسے شاعر کی ذات کا انکشاف ہے جس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے تجربے کو جذبے کی شدت کے ساتھ محسوس بھی کیا ہے - جذبہ جتنا واضح اور روشن ہوگا اسی قدر اس میں تفکر کی پرچھائیاں بھی پڑیں گی - خورشیدالاسلام کے جذبے کی شدت اور وضاحت ہی کہیں کہیں ان کے اشعار میں فکر کی اساس بن گئی ہے - خورشیدالاسلام کے مختصر سے مجموعۂ اشعار میں ان کی انفرادیت کا اظہار ان ہی دو عناصر کے سہارے ہوتا ہے - انکشاف ذات جو کسی ایک فرد کی ذات کا انکشاف نہیں بلکہ پورے معاشرے کے تلخ و ترش حقایق کا انکشاف ہے- مگر ان کی شاعری میں بعض دوسرے معاصر شعراء کی طرح گھٹے ہوئے انفرادی غم کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی کھلی فضا ملتی ہے جس میں ایک ذات کا غم ساری انسانیت کا غم بن جاتا ہے ، اور اسی میں ان کی انسان دوستی کا جاندار تصور نمایاں ہوتا ہے - طنز کی تلخی ، جس میں کلبیت نہیں بلکہ ماحول کے واضح شعور کے ساتھ محسوسات اور جذبات کے

دائرے میں غلط سماجی عوامل پر وار کرنے کا حوصلہ ہے -
انسان دوستی کے اعلیٰ تصور نے ان کے نقطۂ نظر کو بھی
وسعت دے کر ایک ذات کو تمام عالم انسانیت بنا دیا ہے -

خورشیدالاسلام کی شاعری میں انفرادیت کی دریافت کے
بعد ضروری ہے کہ اسی روشنی میں ان کی شاعرانہ خصوصیات
کو سمجھنے کی کوشش کی جائے - خورشیدالاسلام کا لہجہ اور
انداز بیان کلاسکیت سے قریب ہوتے ہوئے بھی کہیں روایتی
نہیں ہونے پایا - ان کی شاعرانہ بصیرت نے روایات کو اُلٹ کر
بھی کلاسیکی انداز کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا - اس کی
مثال یہ شعر ہے -

جنوں نہیں ہے کہ چاک دامن کو آبروئے بہار سمجھیں
خزاں کی یلغار میں بھی ہمدم ہم اپنا دامن سیا گئے ہیں

یہاں بہار کے ساتھ ہی جنوں اور چاک دامن کا روایتی تصور
بالکل اُلٹ دیا گیا ہے- مگر زبان اور علامتیں وہی ہیں ، یہی
کوشش بعض مقامات پر روایت کی توسیع کا سبب بھی بن
گئی ہے -

کہیں لپک اُٹھے شعلے کہیں مہک اُٹھے گل
شب فراق نہ پوچھو کہاں کہاں گذری

اس شعر میں نہ صرف روایت کو وسعت مل گئی ہے

بلکه اس میں گہرائی بھی پیدا ہوگئی ہے - روایت کو نئی زندگی، وسعت اور گہرائی دینے کے لئے استعاروں کا بلیغ اور نیا استعمال بھی ناگزیر ہے - یہ شعر پڑھئے -

شمع جلتی ہے تو پروانوں کا آتا ہے خیال
اور بجھتی ہے تو بجھنے پہ ملال آتا ہے

ان دو مصرعوں میں استعارے کے بلاغت نے زندگی کے رخ سے اس طرح نقاب اُٹھائی ہے کہ بالکل ہی نیا پہلو سامنے آجاتا ہے، یہ شعر دیکھئے -

وہ عشق گل تھا کہ گلچیں کے ہم عدو ٹھیرے
یہ رشک گل ہے کہ ہم باغباں سے روٹھ گئے

استعارے وہی ہیں، علامتیں وہی ہیں مگر ان کے استعمال نے شعر میں بلاغت کے ساتھ ساتھ نزاکت احساس بھی پیدا کردی ہے - خورشیدالاسلام کے «انکشاف ذات» کی شاعرانہ سعی ذہنی واردات کی دریافت کے سہارے آگے بڑھتی ہے، اپنی داخلی کیفیت کی دید ہی ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اس کو زبان دینا تو اور مشکل ہے -

عین ہجراں میں بھی ملتی ہے کبھی لذت وصل
عین لذت میں بھی لذت پہ زوال آتا ہے

اگر آپ اس شعر کو پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر رک کر سوچیں

تو اندازہ ہوگا کہ انسان کے بعض نفسی عوامل کا ایسا مناسب شاعرانہ اظہار کس قدر دقت نظر چاھتا ھے - یہی واردات کہیں کہیں نئی حقیقت کو منکشف کر دیتی ھیں -

کہاں ھیں اہل بہار اور کہاں ھے دعوت گل
کہ بے نصیب گل و گلستاں سے روٹھ گئے

اُمیدوں کی شکست اور خوابوں کی تعبیر کی اس سے زیادہ شاعرانہ تفسیر اور کیا ھو سکتی ھے -

یہ تمام اشعار غزلوں کے ھیں - اگر ان اشعار کو غزل میں رکھکر ان کے مقام پر پڑھا جائے تو ایک اور خصوصیت واضح ھوتی ھے، روایتی غزل گویوں کی طرح خورشیدالاسلام محض ریزہ خیالی کے قائل نہیں، ان کی غزلوں میں فضا اور تاثر کی وحدت ملتی ھے، بہت کم غزلیں ایسی ھیں جن کے اشعار میں مکمل طور پر تاثر کا ربط نہ ملتا ھو یا متضاد کیفیات نظر آئیں - مسلسل غزل کے فن کو برتنے کا رواج آج کے متغزلین میں عام ھے -

خورشیدالاسلام کی غزلوں میں کسی مخصوص ذھنی رویے یا حالات کی ممکن منزلیں حسن ترتیب سے ایک کے بعد ایک سامنے آتی ھیں - ان کی غزلوں کا یہ انداز اُنھیں بھٹکنے سے بچاتا ھے اور جذبے یا احساس کی شدت کو مختلف سمتوں میں

پھیلنے سے روک کر ایک ھی رخ پر ڈال دیتا ھے ۔ اس وحدت تاثر و فکر کے باوجود ان کی غزلوں میں « نظمیت » نہیں آنے پاتی، اس لئے کہ وہ غزل کے کلاسیکی آرٹ کو برتنا جانتے ھیں ۔ انسان دوستی کا ایک مثالی تصور جس کی جڑیں انسانوں کی زمین اور شاعر کے دل میں پیوست ھیں، لہجے کا اعتماد اور موسیقی کی مردانہ لے، پرانی علامتوں اور اِستعاروں کا نئی قوت سے استعمال، ان اشعار کی اهم خصوصیات ھیں ان خصوصیات کے پہلو بہ پہلو دو اور باتیں نمایاں ھیں ۔ ایک تو یہ کہ شاعر ھمیں کہیں یہ محسوس ھونے نہیں دیتا کہ اظہارِ خیال کے لئے شاعرانہ زبان کا التزام کیا گیا ھے، عام طور پر غزل میں چمن کے ساتھہ گل ولالہ، سرو و سمن، نسیم و شمیم، خزاں اور بہار کے الفاظ روایتی طور پر محض زبان کو شاعرانہ رنگ دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ھیں ۔ خورشید الاسلام کہیں بھی یہ التزام نہیں کرتے، وہ روایتی زبان کو شاعری کے لئے لازمی سمجھنے کی بجائے نئے الفاظ کو بھی شعریت میں ڈھالنے اور پُرانے الفاظ کو بھی نئے معنی اور نئی قوت کے ساتھہ استعمال کرنے پر قادر ھیں، اُن کی غزلوں میں لہجے کی مردانگی، طنز کی تلخی اور انفرادیت کے بے محابا اظہار کے ساتھہ ھی موسیقیت کی لہریں بھی آواز کے ارتعاش اور اتار

چڑھاؤ کا ساتھہ دیتی ہیں، ان اشعار کو پڑھئے:

یہ دیکھہ کر کہ غمِ دو جہاں ہے رسمِ جہاں
جو اہلِ غم تھے، غمِ دو جہاں سے روٹھہ گئے

تم صیر فیِ طرۂ زر کارِ عزیزاں
میں حیرتیِ زلفِ بتاں مجھہ کو نہ چھیڑو

خورشید الاسلام کی کئی غزلیں ایسی ہیں جنھیں وحدتِ تاثر کی بنا پر نظم کہا جاسکتا ہے، لیکن مجھے اس سے بالکل بحث نہیں کہ ان کو نظم کہا جائے یا غزل، میں تو محض یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان غزلوں میں زندگی کی حقیقت کے احساس کا ایسا اظہار ہے جو صرف ایک جدید ذہن سے ممکن تھا۔ اس جدید ذہن کا زیادہ مکمل اظہار ان کی نظموں میں ہوتا ہے۔ سرِ راہے، دل، سوال، مجبوری، اندیشے، بےدماغی، تجربہ، ویرانی، آرزو، وجود، یہ تمام نظمیں کسی نہ کسی طرح پُرانی ہیئت کی پابند ہیں، مگر جدید ذہن اپنی تمام پیچیدگی اور تہہ‌داری کے ساتھہ اس پابندی میں نمایاں ہے۔ دوسری نظمیں مثلاً بزرگ، اجنبی، خیر و شر، ایک تاثر، آدمی، انقلاب، نئی دنیا اور پیاس، ہیئت کے لحاظ سے بھی جدید ہیں اور اندازِ بیان میں بھی روایتوں کو توڑنے کا جذبہ محسوس ہوتا ہے۔ مگر اسِ انحراف میں بھی ایک کلاسیکی آہنگ ملتا ہے۔

پابند نظموں میں ' سر راہے ، آرزو ، وجود اور مجبوری ، نئے ذہن کے تجربات اور محسوسات کی پیچیدگی اور شدّت کو بڑی کامیابی سے پیش کرتی ہیں ۔ ان نظموں میں جہاں زندگی پر اعتماد اور حُسن اور خیر سے محبت کا احساس پیدا ہوتا ہے وہیں زندگی اپنی ساری بوقلمونیوں کے ساتھہ نظر کے سامنے بھی آجاتی ہے ۔ « سر راہے » میں جو مرکزی خیال ہے ، وہ جدید دور سے پہلے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا ۔ لیکن اس نظم میں ایک لفظ اور ایک ترکیب بھی ایسی نہیں ہے جس کو خیال کی جدت سے برطرف ہوکر پُرانے سے پُرانا ذہن جو شاعری کی روایتی زبان کا خوگر ہو ، قبول نہ کرسکے ان کی ایک اور نظم « سوال » بھی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ اِس میں وہ اپنے خیال کو زیادہ پھیلا نہیں سکے ہیں ، لیکن وہ زبان اور اندازِ بیان کی کلاسیکی آبرو کو قائم رکھتے ہوئے کم سے کم اتنا تو کر ہی گذرے ہیں کہ اپنے دور کی ، جو مجسم سوال ہے ، صدقِ دل کے ساتھہ نمائندگی کریں ۔ ان کی جدید تر نظموں میں یہی سوالیہ علامت ایک زاویۂ فکر بن گئی ہے ، جس میں موجودہ سماجی اور معاشی ، روحانی اور مذہبی اقدار کی طرف سے بے اطمینانی کا بھی احساس ہے اور اُس روحانی اور مذہبی ناآسودگی کا اظہار بھی جو ہمارے معاشرے میں روشنی

طبع کے امانت داروں کو برداشت کرنی پڑتی ہے، اُن کی ایک نظم «پیاس» ہے جو کافی روشناس ہوچکی ہے - لوگ اس کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ میں نہیں جانتا! لیکن مجھے یہ نظم اس لئے وقیع معلوم ہوتی ہے کہ تصور اور میلان کے اعتبار سے یہ بالکل نئے دوز کی پیچیدہ نفسیات کی نمائندگی کرتی ہے اور اسی کے ساتھہ ساتھہ اس بات کا احساس بھی دلاتی ہے کہ شاعر نے زندہ ماضی کی روایتوں سے اپنا رشتہ نہیں توڑا ہے -

خورشید الاسلام کی بیشتر نظمیں فکر انگیز ہیں اور ان میں کوئی نظم ایسی نہیں جس میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی سمٹ کر ایک مرکز پر نہ آگئے ہوں، یہ نظمیں باوجود اختصار کے ہم کو بلیغ اشارے دے جاتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی نظم ایسی نہیں کہ جس میں انہوں نے زبان کے ساتھہ زیادتی یا توڑ مروڑ کیا ہو، جو نئی نسل کے اکثر نوجوان اپنی خودسری میں اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں مجھے خورشید الاسلام کی شاعری اپنی طرف اس لئے متوجہ کرتی ہے کہ وہ قدامت پرستی کے دشمن ہوتے ہوئے بھی اپنی ثقافتی میراث کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں، میں اپنے مطاب کو واضح کرنے کے لئے چند متفرق اشعار یہاں درج کرنا چاہتا ہوں:

تیرا پھیکا سا تبسم بھی ہے میخانہ بدوش
میری آنکھوں کا لہو بھی کس قدر بے رنگ ہے

دیکھا اُنھیں قریب سے ہم نے تو رو دیئے
جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

یار دنیا کے سانچے میں ڈھلتے رہے
شمع فانوس تھے ہم پگھلتے رہے
اپنی تنہا روی، اپنا سوز دروں،
ہم بھی دنیا میں اک ماجرا ہو گئے

کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب و تب بہم
کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم

وہ سادہ دل ہیں کہ غیروں کو رازداں جانا
وہ بدگماں ہیں کہ ہر رازداں سے روٹھ گئے

وجود آدمی سے پیشتر ہی
سر آدم قلم ہونے لگا ہے

به شکل قامت آدم ، به طرز رقص پری
همارے سر په قیامت بهی کیا جواں گذری

تجهه په کیا گذری که پاس عاشقاں کرنے لگا
یعنی هم پر وه تری مشق ستم جاتی رهی

شمع جلتی هے تو پروانوں کا آتا هے خیال
اور بجهتی هے تو بجهنے په ملال آتا هے

خدا هے شاهد که زندگی میں وه سجده هائے غم محبت
قضا هوئے تهے جو گا هے گاهے به شرط فرصت ادا کیے هیں

یاں کفر و دیں کے جاننے والوں سے کیا غرض
یاں کفر و دیں کے ماننے والوں سے عشق هے

هماری خود نگری کی حکایتیں هیں لطیف
گذر گئی هے زمینوں کو آسماں کہتے

کوئی فریب تراشو، کوئی چراغ جلاؤ
یہ ایک رات کسی طور سے بسر کر جاؤ

ویرانیوں نے بڑھ کے گلے سے لگا لیا
لے کر داوں میں کیسے خزانے چلے تھے ہم

داغ دھل گئے اب تو، درد میں کمی سی ہے
زندگی نہ جانے کیوں پھر بھی اجنبی سی ہے

یہ اشعار ایسے نہیں ہیں جن پر شاعروں کی صحبت میں واہ واہ کی جائے یا سرسری طور پر ان کو سن کر یا ان پر نظر ڈال کر رہ جایا جائے۔ شاعر کا فن نیم اظہار کا فن ہے اور جب تک اس کی گویائی میں اس کے سکوت کی بلاغت کو بھی شامل نہ کرلیا جائے، اس کے شعر کی پوری فکری کائنات کو سمجھنا مشکل ہے۔ شاعر خود سوچ سمجھکر نیم سکوت اور نیم گویائی میں اپنی بات کہتا ہے اور سوچ سمجھکر ہی اس کے اشعار کی معنوی دنیا تک پہونچا جا سکتا ہے۔ یہ اُسی شاعر کی خصوصیت ہوسکتی ہے جو شاعر کے ساتھہ ساتھہ ناقد بھی ہو اور اس کی نظر اس کے دور تک کے مختلف شعری اکتسابات پر گہری ہو۔

اس دور میں اگر کوئی شخص تنقید و تخلیق دونوں میں ایسی چیزیں پیدا کر رہا ہو جو نہ صرف فنی اعتبار سے وقعت اور وزن رکھتی ہیں بلکہ اپنے اندر ایسی فکری اور جمالیاتی کیفیتیں بھی رکھتی ہوں جو ہماری توجہ کو اپنی طرف مائل کئے بغیر نہ رہیں تو ہمیں اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ خورشید الاسلام تنقید میں تو ایک خاص مرتبہ رکھتے ہی ہیں لیکن ان کی شاعری بھی ایسی نہیں جس کی طرف سے سوچنے والے ذہن بے اعتنائی برت سکیں۔

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خورشید الاسلام کی شاعری کی کمیت پر نہیں جانا چاہئے، اس کی کیفیت پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ نئے معانی کی دریافت، پرانے معانی کی توسیع، قدیم اور جدید کا خوشگوار توازن، تجربات کا تنوع، مسائل کی ساری پیچیدگیوں کا گہرا شعور، ایجاز و اختصار اور ایک تازہ و منفرد اسلوب، ان کی شاعری کے امتیازی نشان ہیں۔ تنقید کے ساتھ ساتھ شاعری بھی ان سے مزید اضافوں کا تقاضہ کر رہی ہے۔

مجنوں گورکھپوری

حرفِ اوّل

ہر قطرۂ نیساں کو صدف بھی نہیں ملتی
ہر سینے پہ قرآن بھی نازل نہیں ہوتا

آتی ہے اسی موج سے دریا میں روانی
جس موج کی تقدیر میں ساحل نہیں ہوتا

⦿

کبھی گلوں کبھی خاروں کے درمیاں گذری
صبا چمن سے بظاہر تو شادماں گذری

اسی کا نام ازل ہے، اسی کا نام ابد
وہ ایک رات جو پھولوں کے درمیاں گذری

کہیں لپک اُٹھے شعلے، کہیں مہک اُٹھے گل
شبِ فراق، نہ پوچھو، کہاں کہاں گذری

بہ شکلِ قامتِ آدم، بہ طرزِ رقصِ پری
ہمارے سر پہ قیامت بھی کیا جواں گذری

کبھی کبھی تو غمِ دل کی لے بڑھی اتنی
دلِ حیات کی دھڑکن بھی کچھ گراں گذری

نہ جانے کتنے نشیب و فراز راہ میں تھے
مگر یہ عمرِ دو روزہ رواں دواں گذری

بہم رہے ہیں سر و سینہ یک دگر کیا کیا
کہ سر پہ تیغ پڑی دل سے جب سناں گذری

انسان

یہ رات کے تارے

پلکوں میں چھپائے ہوئے گردوں کے اشارے

چلتے ہیں شب غم میں، شب غم کے سہارے

کرنوں کے صنوبر ہیں ، بہت دور ارم سے

مایوس ہیں ہر رنگ میں، نیرنگ کرم سے

اور پھر بھی کسی شوخ کا منہ چوم رہے ہیں

کس جام کی مستی ہے کہ یوں جھوم رہے ہیں

گویا کہ ، زمانہ میں نہ شر ہے نہ خرابی
دنیا ہے تو سرمست ، خدا ہے تو شرابی

ہم رقص باندازۂ انجام کریں گے
بے نام عبادت سحر و شام کریں گے ،

●

مرنا تھا ناگزیر تو چاہت تھی کیا ضرور
ان کو بھی سوگوار کیا ہائے کیا کیا

غیروں کے آستاں پہ گنوائی تمام عمر
بے وجہ انکسار کیا٠ ہائے کیا کیا

دل

آوارۂ صد بہار ہے دل
تھمتا نہیں بیقرار ہے دل

جمتا نہیں سنگ آستاں پر
پھینکے ہے کمند آسماں پر

پی پی کے شراب زندگانی
برسوں سے ہوا ہے لامکانی

بت گر بھی ھے بت پرست بھی ھے

ھشیار ھے اور مست بھی ھے

سوئے تو بہار بیت جائے

جاگے تو ھزار گل کھلائے

●

خوشا خوشا کہ مرے ہاتھ میں ہے جام شراب
وہ موج رنگ کہ برہم نہ ہو سکی ساقی

مذاق حسن پرستی پہ حرف آئے گا
اگر یہ موج دوعالم نہ ہو سکی ساقی

●

دل ہوا ویراں، متاعِ چشم نم جاتی رہی
رفتہ رفتہ شورش طبع الم جاتی رہی

تجھ پہ کیا گذری کہ پاس عاشقاں کرنے لگا
یعنی ہم پر وہ تری مشق ستم جاتی رہی

ہم کو دنیا سے شکایت ہے کچھ اس انداز کی
تھی کبھی دنیا کو جیسے قدرِ غم، جاتی رہی

میکدہ ہے ، رند ہیں ، ساقی ہے ، دور جام ہے
بزم جم باقی ہے اب تک ، شان جم جاتی رہی

رہ گیا سینہ میں غم ، آثار غم ظاہر نہیں
غمگساروں سے بھی اب ، چشم کرم جاتی رہی

جس کو کہتے ہیں محبت ، ہوگئی اب رسم غیر
جس کو کہتے ہیں مروت ، بیش و کم جاتی رہی

خلش

دل میں جو غم رہ گیا آواز سے خالی ہوا
دل سے جو آواز نکلی اک نیا غم بن گئی

ہم نے جو عالم کیا پیدا ، ادا سے کم رہا
اس ادا کا نام کیا ہوگا جو عالم بن گئی

سوال

پھر لبوں تک یہ حرفِ راز آیا
پھر زباں تک یہ داستاں آئی

موج نے کیوں خرام فرمایا
کیوں حبابوں کی آنکھ بھر آئی

رات کیوں موجِ بادہ اٹھلا کر
اپنے سائے سے آپ شرمائی

شادمانی ہے کیوں رمِ آہو
کس لئے ہے غموں میں گیرائی

بے نشاں ، بے مراد ، بے تنویر
خضر نے خاک زندگی پائی

ظلمتوں کے چراغ جل اُٹھے
آسمانوں سے کیا خبر آئی ؟

تصویر

گیسو کہ جن پہ شب کی سیاہی کا ہو گماں
رخ صبح رنگ، جس میں ملاحت ملی ہوئی

جسم گداز، غیرت نسرین و نسترن
ابرو نہیں، کمانِ فراست ملی ہوئی

وہ گفتگو کہ نجد کے صحرا میں ہو سکوں
حزم و حیاء و حسن و حلاوت ملی ہوئی

آنکھوں کی روشنی میں ذہانت کی بجلیاں
سنجیدگی کے ساتھہ ظرافت ملی ہوئی

ارتقا

دل کو میں نے ناز سکھائے جذبوں کو رقاص کیا
جذبوں کو رقاص بنا کر، سیل فنا میں پھینک دیا

شیشے کے اصنام بنائے، خون جگر آمیز کیا
درد کو پھر فریاد بنا کر، حشر نوا میں پھینک دیا

غم سے میں نے زہر بنایا، زہر کو پھر نوشاب کیا
آخر آخر قلب و جگر کو، دام قضا میں پھینک دیا

حسن یتیمیں کو بیچ کے میں نے حسن طبیعت مول لیا
دیر و حرم کو لاف سمجھ کر، وادی لا میں پھینک دیا

مجبوری

کیوں فسوں کار زمانے کے فسوں یاد کروں
کس لئے شہر کے ویرانوں کو آباد کروں
اپنا غم کم ہے جو اوروں کے الم یاد کروں

دل میں رہ رہ کے یہ بیکار خیال آتے ہیں

عیش پرویز کی بیداد رہے گی کب تک
کاهش محنت فرهاد رہے گی کب تک

درد میں ہمت فریاد رہے گی کب تک

دل میں رہ رہ کے یہ بیکار خیال آتے ہیں

غم، بہلتا ہے جہاں روز سر جام شراب
عین مستی میں گوارا ہے وہاں نام ثواب
کس نے مانگا ہے جو مانگے گا زمانے سے حساب

دل میں رہ رہ کے یہ بیکار خیال آتے ہیں

ہاں تصور میں وہ اگلے سحر و شام نہیں
اس کی نظروں میں بھی فریاد ہے پیغام نہیں

دیر ویران ہے، میخانہ میں اک جام نہیں
دل میں رہ رہ کے یہ بیکار خیال آتے ہیں

غم کے شعلوں سے پگھل جائیں گے میناؤایاغ
بجھ کے رہ جائیں گے اک روز ستاروں کے چراغ
آخر آخر، نہ یہ غنچے ہیں، نہ گل ہیں نہ یہ باغ
دل میں رہ رہ کے یہ بیکار خیال آتے ہیں

ہو جو منظور، تو یاں کعبہ میں اصنام بھی ہیں
شہر یاروں کی نگاہوں میں ابھی دام بھی ہیں

زاویے بھی ہیں، ترانے بھی ہیں ، پیغام بھی ہیں

دل میں رہ رہ کے یہ بیکار خیال آتے ہیں

●

کشتی مے کو تصور میں رواں رکھتے ہیں
جیب خالی ہے مگر دل تو جواں رکھتے ہیں

ہم کہ محروم ہیں دیدار خداوندی سے
چشم ظاہر تو بہ ہر سو نگراں رکھتے ہیں

خانقاہوں سے تعلق ہے نہ درباروں سے
نسبت سلسلۂ زلف بتاں رکھتے ہیں

جھک ہی جاتا ہے فلک آنکھ جہاں پڑتی ہے
چوم لیتی ہے زمیں پاؤں جہاں رکھتے ہیں

ہم سے آباد ہے میخانۂ ہستی یعنی
دل کو رکھتے ہیں سبک، سر کو گراں رکھتے ہیں

ویرانی

ابر بہار بھی نہیں، صوت ہزار بھی نہیں
سایۂ شاخ گل نہیں، لطف کنار بھی نہیں

سر میں عجب خمار ہے اور خمار بھی نہیں!

میرا جہاں ہے بے خبر بادۂ تیغ و جام سے
نغمۂ جوئبار سے، نالۂ زیر دام سے
حزن جفائے دوست سے، عیش بلند بام سے

میرا جہاں ہے بے خبر شورش ہست و بود سے
آتی نہیں ہے بوئے دوست چنگ و رباب وعود سے

٭

وہ چند روز کہ جن کی بہار لٹ نہ سکی
وہ چند روز جنھیں ہم بہار کر نہ سکے

وہ ابتدا جو ہمیں آشکار کر نہ سکی
وہ انتہا جسے ہم آشکار کر نہ سکے

وہ زندگی جو ہمیں معتبر سمجھ نہ سکی
وہ موت ہم جسے بے اعتبار کر نہ سکے

دل میں جب بھی کبھی دنیا سے ملال آتا ھے
کتنے ھی زھرہ جبینوں کا خیال آتا ھے

شمع جلتی ھے تو پروانوں کا آتا ھے خیال
اور بجھتی ھے تو بجھنے پہ ملال آتا ھے

نوک ھر خار نظر آتی ھے کیوں تشنۂ خوں
دشت پر خار میں کیا کوئی غزال آتا ھے

عین ھجراں میں بھی ملتی ھے کبھی لذت وصل
عین لذت میں بھی اذت پہ زوال آتا ھے

سرِ راہے

رباب کا سا تموج، ستار کی سی لے
کہیں کہیں وہ چھلکتا ہوا پیالۂ مے

کوئی ڈھلی ہوئی دھوپ اور کھنچی ہوئی تلوار
کوئی تلاطمِ دریا، کوئی نسیمِ بہار

کوئی حجاب درونِ حجاب و پردۂ ساز
کوئی تمام تکلم، کوئی فقط اک راز

کوئی وہ لہجہ جو داؤد کی زبور میں ہے
کوئی وہ تلخی احساس جو شعور میں ہے

کوئی وہ فکر جو آواز میں بدل جائے
کوئی وہ خندہ جو برپا نہ ہو پگھل جائے

کوئی وہ موسم سرما کی چاندنی کم کم
کوئی وہ رقص جواں، نا تمام اور پیہم

کوئی خیال کی جولانیوں میں خود سے فرار
کوئی ہزار کنایوں میں ایک ہی اظہار

کوئی وہ موج رمیدہ جسے خمار کہیں
کوئی وہ سرو خمیدہ جسے بہار کہیں

کوئی وہ میر کی افسردگی میں تازہ نہال
کوئی تغزل خسرو میں آریوں کا جمال

کوئی وہ برف جو کرنوں کے انتظار میں ہے
کوئی وہ بات جو بجھتے ہوئے شرار میں ہے

کوئی وہ قصہ جو اکثر دراز ہوجائے
کوئی وہ لے جو بڑھے اور ساز ہوجائے

یہ رنگ روپ، یہ سائے' یہ دھوپ چھاؤں، یہ جال
کہیں شریک دو عالم، کہیں خیال محال!

●

زمیں پہ کھلتی رہی ہیں کلیاں، فلک پہ تارے اُگا گئے ہیں
یہی کرشمے ہوا کریں گے، یہی کرشمے ہوا کئے ہیں

دلِ فسردہ نہ رو، کہ آنسو دوائے درد و الم نہیں ہیں
بقدرِ ہمت جیا کریں گے، بقدرِ ہمت جیا کئے ہیں

جنوں نہیں ہے کہ چاکِ دامن کو آبروئے بہار سمجھیں
خزاں کی یلغار میں بھی ہمدم، ہم اپنا دامن سیا کئے ہیں

کسے خبر تھی کہ مے پرستوں کو ان کی خاطر عزیز ہوگا
وہ زہرِ غم جو نہ تھا گوارا، وہ زہر غم جو پیا گئے ہیں

خدا ہے شاہد کہ زندگی میں وہ سجدہ ہائے غم محبت
قضا ہوئے تھے جو گاہے گاہے بشرطِ فرصت ادا کئے ہیں

غلط کہ میں بد گماں ہوں تم سے، خدا سلامت رکھے عدو کو
ہزار وعدے وفا کرو گے، ہزار وعدے وفا کئے ہیں

نہیں ہے موقوف سر کشی پر، مرے لہو میں کچھہ اور بھی ہے
ہزار پہلو ہیں کفرو دیں کے، جو اپنے حق میں روا کئے ہیں

بدل دیں سے انوار کے سحر کو غم شام کہ مینا اُٹھاؤ

جلا گئے ھیں، گے کریں جلا تکلف بے تو حسرت داغِ یہ

آس کیا ہے ، لٹی ہوئی سی بہار
سانس کیا ہے ، کٹی ہوئی سی پتنگ

اک تعلق ہے راز داری کا
ہم سے اور ان سے ورنہ صلح نہ جنگ

ان میں بوئے وفا بھی ہوتی کاش!
جن کی آنکھوں میں ہے شراب کا رنگ!

یار کا دامن نہ جانے کب چھٹا
گرمئی بازار میں کھویا گیا

جام مے، حسن جواں، ذوق نظر
میں انہی دو چار میں کھویا گیا

بیچ دی میں نے نبوت کی قبا
کوچۂ عطار میں کھویا گیا

حیف وہ راہی کہ منزل کے قریب
چشمۂ و کہسار میں کھویا گیا

کاش اس تشنگیٔ غم کے سوا دنیا میں
اپنے جینے کا کوئی اور سہارا ہوتا

کوئی افسانہ جسے اپنی زباں میں کہتے
کوئی افسوں جو زمانے کو گوارا ہوتا

اپنی موہوم امیدوں کی تسلی کے لئے
آسماں پر کوئی دھندلا سا ستارا ہوتا

ہم تو آسودۂ امواج بلا ہو نہ سکے
یہ تو ممکن تھا کہ موجوں میں کنارا ہوتا

اندیشے

صبح بہار کیا ہوئی سرو بلند کیا ہوئے
کچھ تو بتا نم شفق، حسن پسند کیا ہوئے

غنچے کھلے تو ڈال دی بادِ سموم نے کمند
آنکھ جھپک گئی وہیں شوق جہاں ہوا بلند

جوشِ نمود میں کہیں گرمئی شوق کھو نہ جائے
نقش کے انتظار میں حسن خیال سو نہ جائے

عالمِ آب و رنگ میں فرصتِ یک نفس نہیں
موت سے کم نہیں وہ دل، جس پہ ہمارا بس نہیں

٭

ہم بھول گئے جنوں کی باتیں
دل سیکھ گیا زمانہ سازی

روئے گی ہمیں بہت دنوں تک
یارانِ جہاں کی سرفرازی

دیکھو ہمیں غیض کی نظر سے
سیکھو نہ ادائے دل نوازی

ہم بھی بھلا چکے بھی کب کے
سجدے میں ہیں اب تلک نمازی

●

دامن عالم کشادہ اور مرا دل تنگ ہے
یعنی اک مدت سے میرے حوصلوں میں جنگ ہے

سوچنا پڑتا ہے یاں رک رک کے اک اک لفظ کو
اور واں چلتے ہوئے فقروں کی اک فرہنگ ہے

بس کرائے فرط حیا اظہار کی راہیں ہیں بند
بس کرائے احساسِ غیرت پائے جرأت لنگ ہے

میری ہر ندرت پہ ہے فرسودگی کا احتمال
تیری ہر فرسودگی میں اک نیا آہنگ ہے

خون سے میرے ترا دامن اگر تر ہے تو کیا
تیرے چہرے پر ابھی تک سادگی کا رنگ ہے

تیرے دل میں درد مشرق موجزن ہو بھی تو کیا
تیرے لہجہ میں ابھی تک جادوئے افرنگ ہے

یہ توازن، یہ تکلف، یہ تہیں، یہ ناپ تول
معجزہ ہے معجزہ، نیرنگ ہے نیرنگ ہے

میری قسمت ہے مرا ٹوٹا ہوا جامِ سفال
تیری قسمت رقص ہے، رامش ہے، رس ہے، رنگ ہے

تیرا پھیکا سا تبسم بھی ہے میخانہ بدوش
میری آنکھوں کا لہو بھی کس قدر بےرنگ ہے

نوجوان

دل داغ ہے اس غم سے کہ دلبر نہیں ملتا
گردن بھی جھکائے ہیں تو خنجر نہیں ملتا

خوابوں سے الجھتے ہیں حقیقت نہیں ملتی
طوفان سے لڑتے ہیں، سمندر نہیں ملتا

●

ہائے وہ نظریں جو دلکش بھی ہیں اور دلدوز بھی
ہائے وہ دل جو قیامت بھی ہے، بے چارہ بھی ہے

ہائے وہ گیسو جو تابندہ بھی ہیں، شب رنگ بھی
اُف وہ پیشانی جو شعلہ بھی ہے، مہ پارہ بھی ہے

کیا خبر تھی عین ہشیاری میں کھا جائیں گے مات
کیا خبر تھی وہ نگاہِ ناز آوارہ بھی ہے

آرزو صد مشہد گرچہ دل بیدار ہے
ہر شہادت کا مگر بے نام کفارہ بھی ہے

ایک ہی قطرہ ہے جو گوہر بھی ہے شبنم بھی ہے
ایک ہی ذرہ ہے جو ثابت بھی سیارہ بھی ہے

میں ہنس دیا ہوں کبھی عرضِ مدعا میں اگر
وہ رو دیے ہیں یکایک جواب کے بدلے

وہ گمرہی کہ ہے خضر و مسیح سے فارغ
قبول ہے نگہ باریاب کے بدلے

انہیں بھی دیکھ جو منکر ہیں لذت غم کے
انہیں بھی دیکھ جنہیں غم ہی سازگار آیا

وہ اضطرابِ تمنا تھا یا فریبِ نظر
بس ایک بار ہمیں دل پہ اعتبار آیا

یہ رنگ و بوئے گل ولالہ خوب ہیں لیکن
کہاں کہاں سے مرا شوق سوگوار آیا

یہ کس کی زلف کا پرتو ہماری شام پہ ہے
کہ آج اپنی امنگوں پہ ہم کو پیار آیا

یہ اور بات کہ ہم آشنائے راز نہیں
مگر زباں پہ ترا نام بار بار آیا

کوئی تو اپنی محبت کی داستاں ہوتی
کسی سے اپنی محبت کی داستاں کہتے

ہماری خود نگری کی حکایتیں ہیں لطیف
گذر گئی ہے زمینوں کو آسماں کہتے

⊛

کوئی فریب تراشو، کوئی چراغ جلاؤ
یہ ایک رات، کسی طور سے بسر کر جاؤ

طرح طرح سے دلوں کو تپا تپا کے رچاؤ
فریب غیر تو کھائیے، فریب یار بھی کھاؤ

بہت سا رو بھی چکے تم زوال آدم پر
جو ہو سکے تو اب اپنے وجود سے شرماؤ

یہاں تو کوئی نہیں دل تلک اکیلا ہے
قبا کے بند تو کھولو ہمارے پاس تو آؤ

طاقت جو بال و پر میں تھی ، شورش جو آب و گل میں تھی
دیکھا تو آخر فکر کا انداز ہو کر رہ گئی

کاکل کی شب ، رخ کی سحر ، جس جس کی تھی دل کو ہوس
سینہ میں گھٹتے گھٹتے اب اک راز ہو کر رہ گئی

جرأت کو تھا پاسِ حیا اور غم کو تھی قدرِ وفا
نس نس بالآخر جسم کی اک ساز ہو کر رہ گئی

ایسی جفا دیکھا کئے ، ایسے ستم سہنے پڑے
تیری جفا بھی دعوتِ شیراز ہو کر رہ گئی

بے دماغی

اپنوں کے تکلف سے مدارات سے ناخوش
غیروں کی توجہ سے عنایات سے ناخوش

حد یہ ھے کہ آپ اپنی ھی اوقات سے ناخوش
یہ بھی ھے کوئی بات کہ ھر بات سے ناخوش

ان باتوں پہ کیا کیا نہ بھلا خوار ھوئے تم
خود اپنے لئے باعث آزار ھوئے تم

غم دیدہ تو دو چار ہیں غم خوار ہزاروں
ملتے ہیں یہاں دل کے خریدار ہزاروں

ہیں نیک تو دو چار ہی اللہ کے ڈر سے
پر اس کے کرم سے ہیں گنہگار ہزاروں

تجربہ

اک دل کی شرافت پہ ہمیں ناز تھا، لیکن
اس عیب پہ یاروں نے بہت ہم کو رلایا

اک عقلِ سبک سیر تھی کچھ وجہِ تسلی
اس جرم پہ غیروں نے بہت ہم کو ستایا

گھبرا کے گئے خمکدۂ اہل صفا میں
کیا کہیے کہ کیا ان کی سیاست نے ڈرایا

غیروں میں یہاں غیر کوئی ہم نے نہ دیکھا
یاروں میں یہاں یار کوئی ہم نے نہ پایا

●

وہی بادہ ہے وہی پیرِ مغاں ہے اے دوست
یہ جہانِ گذراں پھر بھی جواں ہے اے دوست

میری الفت پہ بھی نفرت کا گماں ہے اے دوست
یہ شکایت نہیں اندازِ بیاں ہے اے دوست

دل وہی دل ہے جو اشکوں میں رواں ہے اے دوست
سر وہی سر ہے جو شانوں پہ گراں ہے اے دوست

اب تو ہر قطرۂ خوں رقص کناں ہے اے دوست
تیری آواز کے قربان کہاں ہے اے دوست

●

بس ہو بھی چکیں حسرتِ پرواز کی باتیں
پھر چھیڑ کسی انجمنِ ناز کی باتیں

کچھ حسن نہ کچھ عشق، سب عریانیِ احساس
یہ راز کی باتیں ہیں، نہ وہ راز کی باتیں

زندگی

ایک غم سو غموں کا بانی ھے
میکدہ پھر بھی ارغوانی ھے

چین ملتا نہیں بہاروں میں
چشمکیں پھر بھی ھیں ستاروں میں
ساغر مے کا اعتبار نہیں
خواھشیں پھر بھی شرمسار نہیں

دل لہو ہو گیا جوانی میں
لطف پھر بھی ہے زندگانی میں

ہاں ابھی کچھ شعور ہے باقی
ایک جرعہ ادھر بھی اے ساقی

●

روٹھے ہوؤں کو اپنے منانے چلے تھے ہم
بگڑی ہوئی تھی بات، بنانے چلے تھے ہم

کیا کہئے آسمان تھا وہ یا زمین تھی
جس پر گلوں کا نقش بٹھانے چلے تھے ہم

دیکھا انہیں قریب سے ہم نے تو رو دئے
جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

دنیا کے ناز دیکھہ کے حیران رہ گئے
گویا اسی کے ناز اٹھانے چلے تھے ہم

ویرانیوں نے بڑھ کے گلے سے لگالیا
لے کر دلوں میں کیسے خزانے چلے تھے ہم

دیکھا جو آپ، اپنے لئے غیر ہوگئے
غیروں کو آئینہ تو دکھانے چلے تھے ہم

●

داغ ڈھل گئے اب تو درد میں کمی سی ہے
زندگی نہ جانے کیوں، پھر بھی اجنبی سی ہے

کل جس آبگینے سے موجِ مے چھلکتی تھی
آج اس آبگینے کی آنکھ میں نمی سی ہے

سیلِ بلا میں خود جو رہا ہے موج کی صورت برسوں تک
سیلِ بلا میں دل کو سکوں ہے، سمجھوگے تو جانوگے

اہل جنوں کے سامنے ہرگز حرفِ جنوں کا نام نہ لو
یہ بھی گویا کارِ جنوں ہے، سمجھوگے تو جانوگے

تیغ و سناں کی چھاؤں میں ہم نے ہوش سلامت رکھے ہیں
یہ بھی اک اندازِ جنوں ہے، سمجھوگے تو جانوگے

جوئے رواں بھی، سنگ گراں بھی، شیشہ بھی ہے تیشہ بھی
دل جو بظاہر قطرۂ خوں ہے، سمجھوگے تو جانوگے

کیا غم جاناں کیا غم دوراں، کیا غم روزی کیا غم مرگ
مرد جہاں ہے صیدِ زبوں ہے، سمجھوگے تو جانوگے

بزرگ

جنہیں بزرگ سمجھتے ہیں باپ جانتے ہیں
وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی شان میں اکثر
کوئی قصیدہ پڑھیں یا کوئی غزل گائیں
تمہیں بتاؤ خدا کے لئے کہ اس دکھہ کو
کہیں تو کس سے کہیں جائیں تو کہاں جائیں

اجنبی

کیسی توانا، کیسی چنچل، کتنی شوخ اور کیا بیباک
کیسی اُمنگیں، کیسی ترنگیں، کتنی صاف اور کیسی پاک
ہوش کی باتیں، شوق کی گھاتیں، جوشِ جوانی سینہ چاک

خندہ ایسا جیسے رقص
باتیں ایسی جیسے ساز

کیسی توجہ، کیسی محبت، جس میں شامل کم کم ناز

اجنبی سے

تیری وادی کے صنوبر ، میرے صحرا کے ببول
اُن پہ اک لرزہ سا طاری ، اِن کے مرجھائے سے پھول
تیرا جی ان سے خفا اور میرا دل ان پر ملول

کیا یہ ممکن ہے کہ ان کا فاصلہ ہو جائے کم
خاک کے سینے پہ آخر کب تلک یہ بار غم

آدمی

ہر گل کا اپنا رنگ ہے، ہر گل کی اپنی .لو
ہر گل کا اپنا نام ہے ہر گل کی اپنی خو

باغوں کے پھول پیارے ہیں، لیکن وہ اجنبی
کھلتے ہیں جو خرابے میں پیارے تو وہ بھی ہیں
ویرانیوں کے راج دلارے تو وہ بھی ہیں
میرے دل و نظر کے سہارے تو وہ بھی ہیں

انقلاب

وہ کاروانِ گلِ تازہ، جس کے مژدہ سے
دماغِ عشق معطر ہے اور فضا معمور
دلوں سے کتنا قریں ہے، نظر سے کتنی دور!

نئی دنیا

صحرا میں بہار آ رہی ہے
ہر گام پہ سو ہزار گل ہیں
گلچیں کی نظر سے ، ہات سے دور
ہر بزمِ طرب کی رات سے دور

ایک تاثر

کاشانہ جل کے خاک ہوا ، اس کا غم بھی ہے
لیکن ذرا قریب سے دیکھو کہ فصلِ گل
گیسو سنوارتی ہے یہاں ، یہ ستم بھی ہے

خیر اور شر

ایک پھرا ناگ

کاجل ناگ

بجلی کی طرح

دفعتاً لپکا کہیں سے تاج کی محراب پر

اور ڈس کر چل دیا

بے خطر، آسودہ، خوش دل، شاد کام

آرزو

ہجوم گل ہے کہ دل اور نظر کا خواب جمیل
ہجوم گل ہے کہ رقصاں ہیں مہر و ماہ و نجوم

ہجوم گل ہے کہ آتش، ہجوم گل ہے کہ رنگ
یہ سیل مے ہے کہ ہے اپنی موج موج سے دنگ

ہجوم گل ہے کہ خوشبو کا ساز بجتا ہے
ہجوم گل ہے کہ یہ میرا دل دھڑکتا ہے

خدا کرے کہ یہ ساعت، یہ ، میں، یہ رنگ، یہ ساز
یہ جوشِ بادۂ گیتی، یہ میرا خوابِ جمیل

نیا دماغ، نیا دل، نئی ادا بن جائیں
یہ سب یہ سب رہیں، پر اس سے کچھ سوا بن جائیں

پیاس

دور سے چل کے آیا تھا میں ننگے پاؤں ننگے سر
سر میں گرد، زباں پر کانٹے، پاؤں میں چھالے، ہوش تھے گم

اتنا پیاسا تھا میں اُس دن، جتنا چاہ کا مارا ہو
چاہ کا مارا، وہ بھی ایسا جس نے چاہ نہ دیکھی ہو

اتنے میں کیا دیکھا میں نے ایک کنواں ہے ستھرا سا
جس کی من ہے پکی اونچی جس پہ چھاؤں ہے پیڑوں کی

چڑھ کر من پہ جھانکا میں نے جوشِ طلب کی مستی میں

کتنا گہرا، اتنا گہرا، جتنی ہجر کی پہلی رات
کیسا اندھا، ایسا اندھا، جیسی قبر کی پہلی رات

کنکر لے کے پھینکا تھا میں
پانی کی آواز نہ آئی
اس کا دل بھی خالی تھا

وجود

قلۂ کوہسار سے ایک ترنجِ زر اُٹھا
نور بہا کرن کرن، وادی نو بہار میں

وادی نو بہار سے ایک حسینہ یوں چلی
لالۂ و گل اِدھر اُدھر، لالۂ و گل کنار میں

دامنِ کوہ دیکھ کر، نور جبیں پہ آگیا
منظرِ ماہ و کہکشاں، پردۂ زر نگار میں

نے میں شرابِ آتشیں، جنبش لب سے ڈال دی
رنگ غضب کا بھر دیا، نغمۂ نو بہار میں

برف کو چوم چوم کر، برف سے کھیلنے لگی
پرتو آفتاب کے دامن تار تار میں

گرمی انبساط سے سینہ میں آگ لگ گئی
خون چھلک گیا، شیشۂ گلعذار میں

مستی شوق میں وہیں برف کا بت بنا لیا
جذبۂ حسن جاگ اُٹھا، سینۂ تابدار میں

رقص کیا قدم قدم، دیدۂ و دل سے، روح سے
راگ بہا چمن، جوشِش انتظار میں

نغمۂ موج موج میں، شام و سحر عیاں ہوئے
رقص ورق ورق ہوا، عالم بے کنار میں

شوخ نے کیف شوق میں، بت کے لبوں کو چھو دیا
لرزش رنگ آگئی، لعبتِ ہمکنار میں

غرفۂ چشم وا ہوئے، ہاتھ ہلے، زباں کھلی
سانس سہم کے رہ گیا، سینۂ راز دار میں

اک دو نفس میں، برق سی کوند گئی زمین پر
بت بھی پگھل کے رہ گیا، دامنِ کوہسار میں

•

جن کے دامن تہی اور خالی تھے دل، جن کی جرأت تھی کم اور جاں مضمحل
آستانوں پہ سجدے وہ کرتے رہے، رفتہ رفتہ ہمارے خدا ہو گئے

اس زمانہ کے جو میر و سلطان تھے، نوعِ آدم میں یعنی جو انسان تھے
دل سے پائی انھوں نے وہ نشوونما، تیرے کوچہ کے آخر گدا ہو گئے

شور سینوں میں اُٹھ اُٹھ کے دبتے رہے، دل جگر دورِ گردوں میں کھپتے رہے
ہاتھ کتنے تھے یاں جو قلم ہو گئے، ساز کیا کیا تھے جو بے صدا ہو گئے

یار دنیا کے سانچے میں ڈھلتے رہے، شمعِ خاموش تھے ہم پگھلتے رہے
اپنی تنہا روی، اپنا سوز دروں، ہم بھی دنیا میں اک ماجرا ہو گئے

اب نہ خطرہ ہے دل میں نہ کوئی خلش، ایک باقی رہا ہے تو رنگ تپش
دل سبک اور سادہ ہے اس طور سے، قرض جتنے تھے گویا ادا ہو گئے

غم سنورتے رہے، ہم سنبھلتے رہے، شوقِ منزل کے شیوے بدلتے رہے
تھے جو نزدیک ہم سے وہ اب دور ہیں، تھے جو ناآشنا، آشنا ہو گئے

●

کس سے کہیں کہ بے سبب صرفہ ہے خوں کا دم بہ دم
دل کی فسردگی کا رنج، شوق کی آبرو کا غم

کچھ تو ہو جس کے فیض سے، دل کو ہو تاب و تب بہم
کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم

درد رواں ہے موج موج، موجِ نفس کے ساتھ ساتھ
موج نفس ہے جاں فزا، لحظہ بہ لحظہ دم بہ دم

رنگ بہ رنگ ہے نظر، ذوق بہ ذوق ہے اثر
دست بہ دست ہے رواں، اوج بہ اوج، جامِ جم

ساز یہی، سبب یہی، طور یہی، طرب یہی
سینہ میں آگ، سر میں شور، چہرہ پہ آب، آنکھ نم

کیسے کہوں کہ بے خودی میرے لئے نشاط ہے
کیسے کہوں کہ ہیچ ہے میرے لئے شکوہ جم

●

بہتر ہے یہی اہل جہاں ؛ مجھ کو نہ چھیڑو
ہے برق مرے دل میں تپاں، مجھ کو نہ چھیڑو

مانا کہ تمھیں پیر زمانہ سے ہے بیعت
حاصل ہے تمھیں قربِ شہاں ، مجھ کو نہ چھیڑو

ناداں تو نہیں ایسے کہ تم مجھ کو نہ جانو
مشہور ہوں میں شوخ زباں ، مجھ کو نہ چھیڑو

اتنا تو ذرا سوچو کہ جس شہر کے تم ہو
اس شہر کا میں بھی ہوں، میاں مجھ کو نہ چھیڑو

جس باغ سے تھا دعوئے نسبت کبھی تم کو
اس باغ کا ہوں سروِ جواں، مجھ کو نہ چھیڑو

کہتے ہیں کہ وسعت ہے بہت کون و مکاں کی
تم کو ہے غمِ کون و مکاں، مجھ کو نہ چھیڑو

بازار میں بکتی ہیں رسولوں کی قبائیں
ہے غم یہ مرے دل پہ گراں، مجھ کو نہ چھیڑو

انسان کو انسان کی توقیر کو بیچو
تم اور سجاؤ یہ دکاں، مجھ کو نہ چھیڑو

تم صیرفیِ طرۂ زرکارِ عزیزاں
میں حیرتیِ زلفِ بتاں، مجھ کو نہ چھیڑو

تم مصلحتِ پیرِ مغاں اول و آخر
میں جرأتِ رندانِ جہاں، مجھ کو نہ چھیڑو

عاشق ہوں، سپاہی ہوں، مجھے سہل نہ جانو
کھیلو کوئی دن تیر و کماں، مجھ کو نہ چھیڑو

تا حدِّ نظر چھلکے ہے ہر جام پہ سوجام
نس نس میں ہے میخانہ رواں؛ مجھ کو نہ چھیڑو

ہے خلوتِ خاصانِ طرب، بھیگ چلی رات
نغموں میں ستارے ہیں رواں، مجھ کو نہ چھیڑو

اک عمر سے میں اور مرے جیب و گریباں
ہیں دست و گریباں صنماں، مجھ کو نہ چھیڑو

ناکام اُمنگوں کی ابھی آنکھ لگی ہے
اے خوش نگہاں، سنگ دلاں، مجھ کو نہ چھیڑو

باغ جہاں کے سادہ جمالوں سے عشق ہے
سبزہ سے، گل سے، سرو سے، لالوں سے عشق ہے

ہاں خاروخس سے دل کو علاقہ ہے پاس کا
ہاں اس چمن کے تازہ نہالوں سے عشق ہے

جو باہنر ہیں ان کے قدم چومتے ہیں ہم
جو بےہنر ہیں ان کے کمالوں سے عشق ہے

بوڑھوں کے پارہ پارہ عزائم کا ہے ملال
بچوں کے تازہ تازہ سوالوں سے عشق ہے

ہر بے نوا فقیر کو دیتے ہیں خون دل
ہر خوش نوا فقیر کے نالوں سے عشق ہے

سارے جہاں کے تلخ نواؤں سے ہے نیاز
سارے جہاں کے شیریں مقالوں سے عشق ہے

یاں کفر و دیں کے جاننے والوں سے کیا غرض
یاں کفر و دیں کے ماننے والوں سے عشق ہے

●

ہوائے گرمی سود و زیاں سے روٹھ گئے
ذرا سی بات پہ سارے جہاں سے روٹھ گئے

وہ عشق گل تھا کہ گلچیں کے ہم عدو ٹھہرے
یہ رشک گل ہے کہ ہم باغباں سے روٹھ گئے

جو بے دماغ تری رہگذر میں آبیٹھے
مکاں تو چیز ہے کیا لامکاں سے روٹھ گئے

جو تیز گام تھا اس کو سکھائی رسم سلوک
جو سست گام تھا اس کارواں سے روٹھ گئے

حرم سے گذرے تو شیخ حرم سے لڑ بیٹھے
مغاں میں پہنچے تو پیر مغاں سے روٹھ گئے

بہ پاس خاطر جاناں ، بہ ناز خودداری
ہم اہل عشق کی وضع فغاں سے روٹھ گئے

ابھی تو خیمۂ لیلیٰ تھا سینکڑوں فرسنگ
کیا جو دل نے جنوں ، سارباں سے روٹھ گئے

وہ سادہ دل ہیں کہ غیروں کو راز داں جانا
وہ بدگماں ہیں کہ ہر راز داں سے روٹھ گئے

یہ دیکھ کر کہ غم دوجہاں ہے رسم جہاں
جو اہل غم تھے، غم دوجہاں سے روٹھ گئے

کہاں ہیں اہل جنوں اور کہاں ہے فیض جنوں
کہ نامراد، دل و دلبراں سے روٹھ گئے

کہاں ہیں اہل بہار اور کہاں ہے دعوت گل
کہ بے نصیب، گل و گلستاں سے روٹھ گئے

کہاں ہے پیر مغاں اور کہاں ہے مژدۂ ہوش
کہ تشنہ لب، رہ و رسم مغاں سے روٹھ گئے

یہ احتیاط نے ساقی کی دل کا حال کیا
کہ رند گرمی بزم جہاں سے روٹھ گئے

•

ترا غم جب سے کم ہونے لگا ہے
ہمیں بھی اپنا غم ہونے لگا ہے

ہمارے آنسوؤں سے گاہے گاہے
ترا دامن بھی نم ہونے لگا ہے

ہم اپنے حال سے ڈرنے لگے ہیں
کہ غمخواروں کو غم ہونے لگا ہے

ھمیں تو آپ ھی تھی خود سے وحشت
تمھیں بھی ھم سے رم ھونے لگا ھے

ھماری راستی کے سامنے اب
ھمارا قد بھی خم ھونے لگا ھے

کبھی تھی جام سے جم کی بڑائی
یہاں ھر جام جم ھونے لگا ھے

کرم کی یہ نگاھیں میری جانب
کرم والو! ستم ھونے لگا ھے

عطا کرتے ہیں جو اہل تواضع
وہ بادہ ہم کو سم ہونے لگا ہے

وجودِ آدمی سے پیشتر ہی
سر آدم قلم ہونے لگا ہے

کوئی چہرہ، کوئی نغمہ، کوئی جام!
خفا دنیا سے دم ہونے لگا ہے

صنم پہلے خدا تھا، اب خدا بھی
تراشیدہ صنم ہونے لگا ہے

یہی گھر تھا کبھی بت خانۂ چیں
یہی گھر جو حرم ہونے لگا ہے

اشعار

گزر چکی ہیں ہزاروں قیامتیں سر سے
مگر مزاج کی شوریدگی نہیں جاتی

جن سے دل مایوس میں گرمی کی رمق تھی
وہ لوگ بھی جب دل سے اتر جائیں تو کیا ہو

اب بھی ہے کوچۂ و بازار میں دلبر کی تلاش
باوجودِ غمِ آوارگی و فکرِ معاش

آ بھی جا اے دوست میں قدموں کی آہٹ کے نثار
کوئی تنہائی سی تنہائی ہے، گھبراتا ہے دل

ہم پہ اگرچہ بھاری گزری ' پھر بھی تھی کیا پیاری رات
آپ بھی تڑپی ساتھ ہمارے ، آپ بھی جاگی ساری رات

یہ میری کم نصیبی ہے ، اگر میرے نہ کام آئی
کسی ناداں کی نادانی ، کسی دانا کی دانائی

غم اتنا دلنشیں ہے کہ اب غم نہیں مجھے
4 گویا کہ زندگی کی خوشی کم نہیں مجھے

اِس سے پہلے کہ غم کون و مکاں کو سمجھو
ہوسکے گر تو مرے غم کی زباں کو سمجھو

تعداد ایک ہزار

اشاعت اول ۱۹۶۱

قیمت ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

طباعت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس